فتویٰ نمبر:122=448/د دارالافتاء،دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز مفتیان، دارالعلوم دیوبند زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میرا سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب کیسے آدمی ہیں؟ کیا ان کے عقائد اہل السنّت والجماعت کے موافق ہیں؟ حدیث اور تفسیر قرآن میں ان کی رائے قابل اعتبار ہے یا نہیں؟ نیز فقہ میں ان کا مسلک کیا ہے؟ وہ کس امام کے مقلد ہیں؟ ہم ان کی باتوں کو سن کر ان پر عمل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ از راہ کرم تشفی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

المستفتی:

ریاض احمد خان

عالیہ پرنٹرس، اترسوئیا (الہ آباد)

موبائل:9794867772

ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب سے متعلق اکثر سوالات آتے رہتے ہیں۔ استفتاء ہذا بھی اسی سلسلے کا ایک سوال ہے، اس میں ڈاکٹر صاحب کے عقائد، ان کا فقہی مسلک اور قرآن وحدیث سے متعلق ان کی تشریحات کے بارے میں تفصیلی جواب کی درخواست کی گئی ہے؛ اس لیے ڈاکٹر صاحب کی تقریر وتحریر کی روشنی میں ایک مفصل جواب لکھا جاتا ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم، حامدا ومصليا ومسلما، الجواب وبالله التوفيق والعصمة.

ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب کے بیانات میں صحیح عقیدے سے انحراف، قرآنِ کریم کی تفسیر میں تحریف ومن مانی، سائنسی تحقیقات سے مرعوبیت، اسلام مخالف مغربی افکار سے ہم آہنگی اور فقہی مسائل میں سلفِ صالحین اور جمہور امت کی راہ سے روگردانی جیسی گمراہ کن باتیں پائی جاتی ہیں، نیز وہ امت مسلمہ کو ائمہ مجتہدین کی اتباع سے پھیرنے، دینی مدارس سے برگشتہ کرنے اور علمائے حق سے عوام کو بدگمان کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ذیل میں ان کی گمراہ کن باتوں میں سے چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) عقیدہ (جو ایک انتہائی نازک چیز ہے جس میں تھوڑی سی بھی لغزش بسا اوقات ایمان کے لیے خطرہ بن جاتی ہے) سے متعلق ڈاکٹر صاحب کی چند باتیں:

(الف) ''وشنو اور برہما کے ذریعے اللہ کو پکارنا جائز ہے''۔

ڈاکٹر صاحب ایک پروگرام میں فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کو ہندوؤں کے معبودان کے نام سے پکارنا جائز ہے، جیسے ''وشنو'' بمعنی رب اور ''برہما'' بمعنی ''خالق'' اس شرط کے ساتھ کہ وشنو کے بارے میں یہ عقیدہ نہ رکھے کہ اس کے چار ہاتھ ہیں اور پرندے پر سوار ہیں''۔ [اسلام اور عالمی اخوت:۳۳،از ڈاکٹر ذاکر نائک]

حالاں کہ غیر عربی زبان کے انہی الفاظ سے اللہ کو پکارنا جائز ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہوں، ان کے علاوہ سے جائز نہیں، تو ''وشنو'' اور ''برہما'' جو ہندوؤں کے شعار ہیں، ان سے اللہ کو پکارنا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟

(ب) ''اللہ کا کلام کونسا ہے، اسے جانچنے کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی سے گزارنا ضروری ہے''۔

ڈاکٹر صاحب ایک پروگرام کے دوران کہتے ہیں:

''ہر انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کی مقدس کتاب ہی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اگر آپ چاہتے ہیں معلوم کریں کہ کون سی کتاب واقعی اللہ کا کلام ہے تو اسے آخری امتحان یعنی جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے گزاریں، اگر وہ جدید سائنس کے مطابق ہو تو سمجھ لیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ہی کلام ہے''۔ [الجواب على ثلاثين جواباً على أن ذاكر الهندي وأصحاب فكره منحرفون ضلالا للشيخ يحى الحجورى]

اس کلام سے ڈاکٹر صاحب کی گمراہ کن جرأت، کتاب اللہ کے تئیں ان کی فکری بے راہ روی نیز جدید سائنس سے خطرناک حد تک مرعوبیت کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہر آن بدلنے والی سائنسی تحقیقات کو آسمانی کتابوں بالخصوص کلامِ الٰہی قرآنِ کریم کو پرکھنے کا معیار قرار دے دیا، جب کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کی سب سے بڑی دلیل، اس کا اعجاز ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ قرآن میں چیلنج کیا ہے۔

(ج) ''فتویٰ دینے کا حق ہر کس وناکس کو ہے''۔

ڈاکٹر صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں: ''ہر کسی کے لیے فتویٰ دینا جائز ہے؛ اس لیے کہ فتویٰ کا معنی رائے دینا ہے''۔ [حوالۂ بالا]

یہاں ڈاکٹر صاحب فتویٰ دینے جیسے اہم کام-جس میں (علامہ ابن القیمؒ کے لفظ کے مطابق) مفتی احکام الٰہی کے بیان میں رب کائنات کا ترجمان اور اس کی نیابت میں دستخط کرنے کا ذمے دار ہوتا ہے ''**لم تصلح مرتبة التبليغ بالرواية والفتيا إلا لمن اتصف بالعلم والصدق... وإذا كان منصب التوقيع عن الملوك بالمحل الذي لا ينكر فضله ولا يجهل قدره... فكيف بمنصب التوقيع عن رب الأرض والسماوات، فحقيق بمن أقيم في هذا المنصب أن يعدله عدته ويتأهب له أهبته وأن يعلم قدر المقام الذي أقيم فيه**'' [إعلام الموقعين: ۱/ ۹۱]- کو، رائے دینے کے ہلکے پھلکے لفظ سے تعبیر کرکے، صرف اپنے لیے ہی نہیں؛ بلکہ ہر کس وناکس کے لیے اس کا جواز فراہم کررہے ہیں، اور انھوں نے قرآنِ کریم کی آیت ﴿**فَاسْأَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ**﴾ یعنی اگر تمھیں علم نہیں ہے تو اہل علم سے دریافت کرلو، اور حدیث نبوی ''**من أفتىٰ بغير علم كان إثمه على من أفتاه**'' [أخرجه أبوداؤد في سننه: ۳۵۹، رقم: ۳۶۵۹۳، باب تفسير القرآن عن رسول الله صلى الله عليه وسلم] (یعنی جو آدمی بلا (صحیح) معلومات کے فتویٰ دیدیتا ہے تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا) کو بالکل فراموش کردیا۔

(۲) تفسیر قرآن میں من مانی تشریح یعنی تحریف معنوی:

قرآن کریم کی تفسیر کا معاملہ بڑا نازک ہے؛ اس لیے کہ مفسر آیتِ کریمہ سے مرادِ خداوندی کی تعیین کرتا ہے کہ اللہ نے یہ معنی

مرادلیاہے؛لہٰذاناہل آدمی کااس وادی میں قدم رکھنا انتہائی خطرناک ہے،حدیث میں ہے:"**من قال في القرآن برأيه فأصاب فقد أخطأ**" (أخرجه الترمذي: رقم: ٢٧٧٦) (یعنی جوآدمی محض اپنی عقل سے تفسیر کرے تواگرچہ وہ اتفاقاً درست معنی تک پہنچ جائے، پھربھی اسے غلطی کرنے والاسمجھاجائے گا،ایک دوسری روایت میں ہے:"**من قال في القرآن برأيه فليتبوّأ مقعده من النَّار**" [أخرجه الترمذي: ١٩٩/٥، رقم: ٢٩٥١] اسی لیےمفسر کے لیے بہت سی شرائط ہیں،مثلاً قرآن کی تمام آیتوں پرنظر،ذخیرۂ حدیث سے متعلق وسیع معلومات،عربی زبان اوراس کے قواعد:نحو،صرف اوراشتقاق اورفصاحت وبلاغت کااچھاعلم ہووغیرہ۔جہاں تک ڈاکٹرصاحب کاتعلق ہے،توان کے اندرمذکورہ شرائط میں سے ایک بھی شرط ضروری حدتک نہیں پائی جاتی،نہ وہ عربی زبان اوراس کے قواعد سے کماحقہ واقف ہیں اورنہ ذخیرۂ حدیث پرگہری نظرہے اورنہ ہی فصاحت وبلاغت سے کوئی زیادہ واقفیت ہے۔(ذیل کی مثالوں سے یہ باتیں واضح ہوجائیں گی)جب کہ تفسیر میں گمراہی میں پڑنے کے جتنے اسباب ہیں مثلاً حضورصلی اللہ علیہ وسلم اورصحابہ وتابعین سے منقول تفسیروں سے روگردانی،زمانے کے افکار سے مرعوبیت اورقرآنِ کریم کے موضوع کوغلط سمجھناوغیرہ،ڈاکٹرصاحب کے اندر بدرجۂ اتم موجود ہیں؛اسی لیےانھوں نے دسیوں آیتوں کواپنی ناواقفیت سے مشقِ ستم بنایا،ذیل میں چندنمونے ملاحظہ فرمائیں:

(الف) آیت کریمہ ﴿الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ کی تفسیر میں ڈاکٹرصاحب کہتے ہیں:

> لوگ کہتے ہیں کہ لفظ "قوام" کامعنی ایک درجہ اوپر ہونے کے ہیں؛لیکن اصل "قوام" ،"إقامة" سے نکلا ہے،"إقامة" کامطلب کھڑاہونے کے ہیں؛لہٰذا"إقامة" کامطلب ہوا کہ ایک درجہ ذمے داری میں اونچاہے،نہ کہ فضیلت میں۔[خطبات ذاکرنائک:۲۹۵،م:فریدبکڈپودلی]

ڈاکٹرصاحب نے مغربی نظریۂ مساوات کی تائید میں آیت قرآنی کی من مانی تفسیر کرتے ہوئے مردوں کے ایک درجہ فضیلت میں اونچاہونے کی نفی کردی،جب کہ امت کے بڑے بڑے مفسرین نے فضیلت میں اونچاہونے کامعنی بیان کیاہے،چناں چہ ابن کثیرنے ﴿الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ کےتحت لکھا: **أي الرجل قيم على المرأة أي هو رئيسها وكبيرها والحاكم عليها، مؤدّبها إذا اعوَجَّتْ** (یعنی مردکی حیثیت اس کی بیوی کے سامنے حاکم اورسردارکی ہے،ضرورت محسوس ہونے پرشوہر بیوی کی مناسب تادیب بھی کرسکتاہے۔نیزآیت کریمہ ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ کی تفسیر میں ابن کثیرنے لکھاہے:**وللرجال عليهن درجه أي في الفضيلة في الخلق والمنزلة وطاعة الأمر والإنفاق والقيام بالمصالح والفضل في الدنيا والآخرة** (۱/۶۱۰) یعنی شوہر بیوی سے فضیلت،رتبہ،اطاعت وغیرہ میں ایک درجہ اونچاہے،نیز ڈاکٹرصاحب کی تفسیر حدیث نبوی،**لو كنت آمرًا أحدًا أن يسجد لأحد، لأمرت النساء أن يَسْجُدْن لأزواجهن** [أخرجه أبوداؤد] یعنی اگراللہ کےسواکسی اورکوسجدہ جائز ہوتاتومیں عورتوں کوحکم دیتاکہ وہ اپنے شوہروں کوسجدہ کریں،کے خلاف ہے؛اس لیے کہ اگردونوں فضیلت میں برابرہوتے اورشوہرکو عورت پرکوئی برتری حاصل نہ ہوتی تو حضورصلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کواپنے شوہروں کوسجدہ-جوانتہائی تعظیم ہے-کاحکم کیوں دینے والے تھے۔

(ب) ڈاکٹرصاحب،ایک سوال-''قرآن کریم میں ہے کہ کسی ماں کے رحم میں موجودبچے کی جنس صرف اللہ کومعلوم ہے؛ مگراب سائنس کافی ترقی کرچکی ہےاورہم آسانی سے الٹراسونوگرافی کے ذریعے''جنین'' کی تعیین کرسکتے ہیں،کیایہ قرآنی آیت، میڈیکل سائنس کےخلاف نہیں ہے؟-کے جواب میں فرماتے ہیں:

> .....''یہ صحیح ہے کہ قرآن کی اس آیت کےمختلف ترجمےاورتشریحات میں کہاگیاہے کہ صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ

ہی جانتا ہے کہ ماں کے رحم میں موجود بچے کی جنس کیا ہے؟؛ مگر اس آیت کا عربی متن ملاحظہ کریں تو دیکھیں گے کہ انگلش کا لفظ (Sex) کا کوئی عربی متبادل استعمال نہیں ہوا، اصل میں قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ رحموں میں کیا ہے؟ اس کا علم صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ہے، کافی مفسرین کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے اس کے یہ معنی مراد لیا ہے کہ اللہ ہی ماں کے رحم میں بچے کی جنس کو جانتا ہے، یہ درست نہیں، یہ آیت جنین کی جنس کی طرف اشارہ نہیں کرتی؛ بلکہ اس کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ماں کے رحم میں موجود بچے کی فطرت کیسی ہوگی؟ وہ کیا اپنی ماں باپ کے لیے باعثِ رحمت ہوگا یا عذاب''؟ الخ [اسلام پر چالیس اعتراضات:۱۳۰، از ڈاکٹر ذاکر نائک، م: اریب پبلیکیشنز، دہلی]

ڈاکٹر صاحب نے یہاں پر سائنسی تحقیق سے مرعوب ہوکر، اس سے پیدا ہونے والے سرسری اعتراض سے بچنے کے لیے، قرآن کی دوسری آیت اور صحابہ وتابعین سے منقول تفسیر کو پس پشت ڈالتے ہوئے، ایک معروف معنی کا انکار کردیا اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید اور ان کی تغلیط کر ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب نے جو معنی بیان کیا ہے 'ما' موصولہ کے عموم میں آسکتا ہے اور بہت سے مفسرین نے ایک احتمال کے طور پر، پہلے معنی کے ضمن میں اس کا بھی ذکر کیا ہے؛ لیکن دوسرے معنی کا انکار کردینا قطعاً صحیح نہیں؛ بلکہ ڈاکٹر صاحب کی قلت تدبر اور تفسیر میں صحابہ اور تابعین کے اقوال سے روگردانی کی واضح دلیل ہے؛ اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب نے جس معنی کی نفی کی ہے، اسی کی طرف سورۂ رعد کی آیت ﴿اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ﴾ [الرعد:۸] ''یعنی اللہ تعالیٰ کو سب خبر رہتی ہے کہ جو کچھ کسی عورت کو حمل رہتا ہے اور جو کچھ رحم میں کمی بیشی ہوتی ہے'' اشارہ کررہی ہے، نیز مشہور تابعی اور تفسیر کے امام قتادہؒ سے بھی یہی معنی مروی ہے، چنانچہ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: ''فلا يعلم ما في الأرحام أذكر أم أنثى ''الخ یعنی رحم مادر میں نر ہے یا مادہ اس کا قطعی علم سوائے خدا کے کسی اور کو نہیں، اسی طرح ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر (۳۵۵/۶) میں، علامہ نسفیؒ نے تفسیر مدارک (۱۱۶/۳) میں اور امام شوکانیؒ نے فتح القدیر (۴۹۸/۵ میں، مذکورہ آیت کا یہی معنی بیان فرمایا؛ لیکن ڈاکٹر صاحب ان اکابر مفسرین کے بیان کردہ معنی کو غلط ٹھہراکر، اپنے بیان کردہ معنی کو قطعی سمجھ کر اسی پر مصر ہیں۔

صحیح جواب: آیتِ کریمہ کا مقصد اللہ تعالیٰ کے لیے علمِ غیب کو ثابت کرنا ہے اور علم غیب درحقیقت اس یقینی علم کو کہا جاتا ہے جو کسی سبب ظاہری کے بغیر براہِ راست، کسی آلے کے بغیر حاصل ہو، طبی آلات سے ڈاکٹروں کو حاصل ہونے والا علم نہ یقینی ہوتا ہے اور نہ ہی بلاواسطہ؛ بلکہ وہ محض ظنی ہے اور آلات کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے؛ لہٰذا الٹراسونوگرافی کے ذریعے حاصل ہونے والے اس ظنی علم سے قرآنی آیت پر کوئی اعتراض وارد نہ ہوگا۔

(ج) ڈاکٹر صاحب آیت کریمہ ﴿يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآئَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰى اَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا﴾ [الممتحنة: ۱۲] کی تفسیر میں کہتے ہیں:

''یہاں لفظ ''بیعت'' استعمال ہوا ہے اور بیعت کے لفظ میں ہمارے آج کل کے الیکشن کا مفہوم بھی شامل ہے؛ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول بھی تھے اور سربراہ مملکت بھی تھے اور بیعت سے مراد انھیں سربراہ حکومت تسلیم کرنا تھا، اسلام نے اسی دور میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق بھی تفویض کردیا تھا'' [اسلام میں خواتین کے حقوق:۱۵۰ از ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب]

یہاں بھی ڈاکٹر صاحب آیت کی غلط تشریح کرتے ہوئے، اس سے عورت کے ووٹ دینے کا حق ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ عورتوں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر بیعت کرنا، موجودہ دور کے جمہوریت کے طرزِ انتخاب کی ہی قدیم شکل ہے، جب

کہ جمہوریت کی حقیقت سے جولوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تشریح بالکل واقع کے خلاف ہے اور تفسیر قرآنی میں اپنی عقل کا بیجا استعمال ہے؛ اس لیے کہ موجودہ جمہوریت کے مطابق سب کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ سربراہ چننے کے لیے اپنی رائے دیں اگر کسی شخص پر کثرت واتفاقِ رائے نہ ہوتو وہ سربراہ نہ بن سکے گا، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بیعت کرنا درحقیقت ووٹ لینا تھا، تو کیا ان صحابیات کو اختیار تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی تسلیم کرنے سے انکار کردیں؟

(د) سورۂ مریم کی آیت ﴿یَا اُخْتَ هَارُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا﴾ [مریم: ۲۸] پر ناسمجھی سے کیا جانے والا معروف اشکال -حضرت مریم علیہا السلام، حضرت ہارون کی بہن نہیں تھیں اور دونوں کے زمانے میں تقریباً ایک ہزار سال کا فاصلہ ہے- کے جواب میں فرماتے ہیں:

''عیسائی مشنری یہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یسوع مسیح کی والدہ (Mary) مریم اور ہارون کی بہن مریم میں فرق کا پتہ نہیں تھا، حالاں کہ عربی میں ''اخت'' کے معنی اولاد بھی ہیں؛ اس لیے لوگوں نے مریم سے کہا کہ اے ہارون کی اولاد اور اصل اس سے مراد حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد ہی ہے'' [اسلام پر چالیس اعتراضات، از: ڈاکٹر ذاکر نائک]

ڈاکٹر صاحب کی، احادیث اور لغت سے نادانی اور جہالت پر مبنی اس تحقیق پر تبصرے کے طور پر مسلم شریف کی حدیث ہی کافی ہے، صحیح مسلم میں ہے: **عن المغيرة بن شعبة قال: لما قدمت نجران سألوني، فقالوا: إنكم تقرأون يا أخت هارون وموسى قبل عيسى بكذا وكذا، فلما قدمت على رسول الله -صلى الله عليه وسلم- سألته عن ذلك فقال: إنهم كان يسمّون بأنبيائهم والصالحين قبلهم.** [مسلم: ۶/ ۱۷۱، دار الجيل بيروت، رقم: ۵۷۲۱] یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی وضاحت آج سے چودہ سو سال پہلے ہی کردی تھی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم، حضرت موسیٰ کے بھائی حضرت ہارون کی بہن نہ تھیں؛ بلکہ حضرت عیسیٰ کی والدہ کے بھائی کا نام بھی ہارون تھا، اور یہ لوگ اپنے انبیاء اور گزشتہ برگزیدہ شخصیات کے ناموں پر اپنا نام رکھا کرتے تھے۔ اس سے پتہ چلا کہ نہ یہ کوئی نیا اعتراض ہے اور نہ ہی اپنی جانب سے جواب گھڑنے کی کوئی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تفسیر سے متعلق احادیث سے بے خبری کس قدر ہے کہ ذخیرۂ احادیث وتفسیر سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کے بجائے من گھڑت تاویل کررہے ہیں۔

(ھ) ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب آیت کریمہ ﴿وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحَاهَا﴾ [النازعات: ۳۰] کے متعلق کہتے ہیں:

''یہاں انڈے کے لیے استعمال کیا جانے والا عربی لفظ ''دحھـــا'' ہے، جس کا مطلب شترمرغ کا انڈا، شترمرغ کا انڈا زمین کی شکل سے مماثلت رکھتا ہے؛ لہٰذا قرآنِ کریم مکمل درستگی سے زمین کی شکل کی وضاحت کرتا ہے، حالاں کہ اس وقت جب قرآن اتارا گیا یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زمین چپٹی (Flat) ہے''۔ [خطبات ذاکر نائک، قرآن اور جدید سائنس: ۴۷-۴۳]

یہاں پر ڈاکٹر صاحب سائنسی نظریہ سے مرعوب ہونے، نیز قرآنِ کریم کے موضوع (جو کہ توحید اور رسالت ہے اور باقی طبعیات وغیرہ کی باتیں ضمناً ہیں) کو نہ سمجھنے کی وجہ سے، زمین کی ہیئت کی تحقیق کرنے میں، آیت کریمہ سے غلط استدلال کرتے ہوئے آیت کی من مانی تشریح کررہے ہیں؛ اس لیے کہ 'دحـــو' کا لفظ ومادہ عربی زبان میں پھیلانے اور پھلاؤ کا مفہوم رکھتا ہے، اسی کے

مطابق 'دحٰھا' کی تفسیر وترجمہ زمین کو پھیلانے سے،اوراس میں موجود اشیاء کے پیدا کرنے سے کیا گیا ہے(ملاحظہ ہو کہ تفسیر ابن کثیر) یہ لفظ و مادّہ انڈے کے معنی میں نہیں آتا۔

(۳) احادیث نبویہ سے ناواقفیت

ذخیرۂ حدیث سے ناواقفیت کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے بہت سی جگہوں پر صحیح احادیث کے خلاف مسائل بتلائے، نیز کتنے ہی مقامات پر کسی مسئلے پر متعدد احادیث ہونے کے باوجود یہ کہہ ڈالا کہ اس باب میں کوئی دلیل نہیں، ذیل میں ڈاکٹر صاحب کی احادیث سے جہالت یا دانستہ چشم پوشی کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں:

(الف) عورتوں کے لیے حالتِ حیض میں قرآن پڑھنے کا جواز

ایک پروگرام ''گفتگو'' میں عورت کے خاص ایام کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

''قرآن وحدیث میں نماز کی رخصت ہے؛لیکن کسی حدیث میں نہیں کہ وہ قرآن نہیں پڑھ سکتی''۔

حالاں کہ ترمذی شریف میں صریح حدیث ہے:''**لا تقرأ الحائض ولا الجنب شیئًا من القرآن**'' یعنی جنبی اور حائضہ قرآن نہ پڑھیں۔

آپ غور کیجیے کہ ڈاکٹر صاحب نے صحیح وصریح حدیث کے موجود ہونے کے باوجود، دعویٰ ہمہ دانی کرتے ہوئے اس کا انکار کردیا۔

(ب) خون سے وضو ٹوٹنے پر، احناف کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے

ڈاکٹر صاحب ایک تقریر میں خون سے وضو ٹوٹنے اور نہ ٹوٹنے کے موضوع پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''بعض علمائے کرام خصوصاً فقہِ حنفی سے متعلق علمائے کرام کے خیال میں خون بہنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، نماز کے دوران خون بہہ جانے کی صورت میں کس کو کیا کرنا چاہیے،اس سوال کے جواب میں ان کا فتویٰ (احناف کا فتویٰ) بہت طویل ہے تاہم ان کے اس نقطۂ نظر کی تائید میں بہ ظاہر کوئی ثبوت نہیں ہے''۔[حقیقت ذاکر نائک: ۲۱۴،م: مکتبہ مدینہ دیوبند]

یہاں پر ڈاکٹر صاحب نے فقہِ حنفی سے متعلق علما پر الزام لگا ڈالا کہ وہ بلاثبوت وضو ٹوٹنے کی بات کہتے ہیں، حالاں کہ خون سے وضو ٹوٹنے کے سلسلے میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں، نیز صحابۂ کرام کا تعامل بھی اسی پر رہا، ذیل میں چند روایتیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) **أخرج البخاري عن عائشه –رضي الله عنها– قالت: جاء ت فاطمة بنت أبی حبیش إلی النبي –صلی الله علیه وسلم– فقالت: یا رسول الله! إنی امرأة أستحاض فلا أطهر، أفأد ع الصلاة؟ قال: لا، إنّما ذلک عرق ولیست بالحیضة، فإذا أقبلت الحیضة فدعي الصَّلاةَ وإذا أدبَرتْ فاغسلِي عنک الدَّم قال هشام: قال أبي ثم توضئي لکل صلاة حتیّ یجیئ ذلک الوقت.**

(۲) **إذا رعف أحدکم في صلاته فلینصرف فلیغسل عنه الدّم ثم لیعد وضوء ه ویستقبل صلاته أخرجه الدارقطني.** یعنی دورانِ نماز اگر کسی کی نکسیر پھوٹ جائے تو اسے چاہیے کہ خون کو دھولے اور وضو دہرائے۔

(۳) **عن زید بن ثابت –رضي الله عنه–: الوضوء من کل دم سائل. أخرجه ابن عدي في الکامل** (نصب الرایة للإمام الزیلعي: ۱/ ۳۷) یعنی خون بہنے سے وضو لازم ہوجاتا ہے۔

یہ اور ان کے علاوہ بہت سی روایات کے باوجود، ڈاکٹر صاحب نے، اپنی ناواقفیت کا اظہار نہ کرکے مجتہدانہ دعویٰ کردیا کہ بہ

ظاہرخون سے وضوٹوٹنے پرکوئی ثبوت نہیں ہے۔

(ج) مردوعورت کی نماز میں فرق کرنا جائزنہیں۔

ایک دوسری جگہ ڈاکٹر ذاکرنائک صاحب مرداورعورت کی نماز میں فرق کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

''کہیں بھی ایک صحیح ومستند حدیث نہیں ملتی جس میں عورت کے لیے مرد سے علاحدہ طریقے کے مطابق نماز ادا کرنے کا حکم ہو، اس کے بجائے صحیح بخاری کی روایت ہے، حضرت ام درداء روایت کرتی ہیں کہ التحیات میں عورتوں کو مردوں کی طرح بیٹھنے کا حکم ہے''۔

یہاں ڈاکٹر صاحب نے دو باتیں سراسر غلط کہیں ہیں:

(الف) نماز میں مردوعورت کے درمیان فرق کے سلسلے میں کوئی حدیث نہیں۔

(ب) حضورصلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مردوں کی طرح بیٹھنے کا حکم دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے پہلی بات کہہ کران تمام احادیث کا انکار کردیا، جن میں مردوں اورعورتوں کی نماز کے درمیان فرق کا بیان موجود ہے۔ذیل میں چندروایتیں ذکرکی جاتی ہیں:

(۱) **أخرج البخاري عن النبي –عليه السلام– أنه قال: يا أيّها الناس! مالكم حين نابكم شيء في الصّلاة، أخذتم في التصفيق، إنما التصفيق للنساء** [١/ ١٧٤، رقم الحديث: ٦٨٤]

(۲) **عن وائل بن حجر قال لي رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا وائل بن حجر! إذا صليت فاجْعل يَديك حذاء أذنيك والمرأة تجعل يديها حذاء ثدييها.** [المعجم الكبير للطبراني]

(۳) **عن يزيد بن أبي حبيب أن رسول الله –صلى الله عليه وسلم– مرّ على امرأتين تُصلّيان فقال: إذا سجدتما فضُمَّا بعض اللَّحم إلى الأرض؛ فإنّ المرأة ليست في ذلك كالرجل** [أخرجه أبوداؤد مرسلاً والبيهقي موصولاً]

(۴) **سُئل ابن عمر كيف كن النساء يصلين على عهد رسول الله –صلى الله عليه وسلم– قال: كُنّ يتربّعن ثُم أُمِرْن أن يتحَفَّزن** [جامع المسانيد والسنن]

ان روایات میں مردوں اورعورتوں کی نماز میں مختلف طرح کے فرق کا ذکر ہے۔ان کے علاوہ اوربھی حدیثیں ہیں، اس موضوع پرلکھی گئی کتابوں میں تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔اور جہاں تک دوسری بات یعنی بخاری شریف میں عورتوں کومردوں کی طرح بیٹھنے سے متعلق حکم نبوی کی بات تو یہ ایک غلط انتساب ہے، حضرت ام الدرداء کی جس روایت کا ڈاکٹر ذاکرصاحب نے حوالہ دیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: ''**وكانت ام الدرداء تجلس في صلاتها جلسة الرجل وكانت فقيهة**'' [بخاری شریف: ١/ ١١٤]

اس میں کہیں بھی حضورصلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کا ذکرنہیں ہے؛ بلکہ ایک صحابیہ کا عمل ہے، جس کا ذکرکرکے امام بخاری نے اشارہ بھی کردیا کہ وہ خود فقیہہ تھیں وہ اپنے اجتہاد سے ایسا کرتی تھیں، نیز امام بخاریؒ نے اسے تعلیقاً ذکرکیا ہے، سند ذکرنہیں کی ہے۔

(۳) ائمہ مجتہدین کے اتباع سے فراراور مسائلِ فقہیہ میں سوادِاعظم کی راہ سے نمایاں انحراف ڈاکٹر ذاکرنائک صاحب اپنی تحریرات اورتقریرات کی روشنی میں کسی امام کے متبع معلوم نہیں ہوتے؛ بلکہ اباحیت، جدت پسندی نیز غیرمقلدیت اورلامذہبیت کے شکار ہیں، صرف یہی نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کسی متعین امام کی تقلید نہیں کرتے؛ بلکہ ائمہ کی تقلید کرنے والے مخلص عوام کوعدمِ تقلید کی روش اپنانے کی تعلیم دیتے ہیں اوراپنے بیان کردہ مسائل میں کہیں کسی امام، کہیں کسی امام کا قول واستنباط کردہ حکم کواپنی طرف منسوب کرکے

نقل کرتے ہیں، اور کہیں خود مجتہدانہ انداز پر مسئلے بیان کرنے لگتے ہیں، جب کہ ان کو مسائل نقل کرنے میں اس متعین امام کا نام لینا چاہیے، جنھوں نے اس مسئلے کا استنباط کیا ہے؛ تاکہ سننے والے کو یہ مغالطہ نہ ہو کہ قرآن وسنت سے صرف یہی ثابت ہے، اس کے علاوہ جو دوسری باتیں لوگوں کے عمل میں ہیں۔ چاہے وہ قرآن وحدیث سے ثابت اور ائمہ مجتہدین کا قول کیوں نہ ہو۔ غلط ہے۔ ذیل کی مثالوں سے مذکورہ باتوں کا بہ خوبی اندازہ ہوجائے گا، ملاحظہ فرمائیں:

(الف) بلاوضو قرآن چھونا جائز ہے

ڈاکٹر صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں:

''بلاوضو قرآنِ کریم چھونے کی اجازت ہونی چاہیے'' الخ

حالاں کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ قول آیتِ کریمہ ﴿لَا يَمَسُّهُ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ نیز تمام ائمہ مجتہدین کے خلاف ہے۔

(ب) خطبۂ جمعہ عربی زبان کے بجائے مقامی زبان میں ہونا چاہیے

ایک موقعہ پر خطبۂ جمعہ سے متعلق ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں جمعہ کا خطبہ مقامی علاقائی اور مادری زبانوں میں دیئے جانے کا اہتمام کیا جائے تاکہ..'' الخ

حالاں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک خطبۂ جمعہ عربی زبان میں دینے پر توارث چلا آرہا ہے، آج ڈاکٹر صاحب یہ دعوت دے رہے ہیں کہ خطبہ مقامی زبان میں ہونا چاہیے؛ تاکہ لوگ سمجھ سکیں، جب کہ یہ مصلحت (غیر عربی جاننے والوں کا سمجھنا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی موجود تھی؛ اس لیے کہ حضور علیہ السلام کے خطبے میں عرب کے علاوہ عجم کے لوگ بھی شریک ہوتے؛ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ عربی زبان میں خطبہ دیا، کسی دوسری زبان میں خطبہ نہیں دلوایا، اور نہ ہی بعد میں اس کا ترجمہ کروایا، اسی طرح صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین اور ان کے متبعین عرب سے نکل کر عجم میں گئے، مشرق ومغرب میں اسلام پھیلایا؛ لیکن ہر جگہ ہمیشہ خطبۂ جمعہ عربی ہی میں دیا، حالاں کہ ان حضرات کو تبلیغ دین کی ضرورت آج سے زیادہ تھی، جب کہ بعض صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم عجمیوں کی زبان خوب جانتے تھے؛ لیکن پھر بھی خطبۂ جمعہ عربی ہی میں دیا کرتے تھے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ خلفائے راشدین صحابۂ کرام اور تابعین عظام کے تعامل ومواظبت اور ساری امت کا توارث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خطبہ عربی زبان ہی میں ضروری ہے، یہاں تک کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کی صحت کے لیے خطبہ کا عربی زبان میں ہونا ضروری ہے، اگرچہ پورا مجمع عجمیوں کا ہو، عربی کوئی نہ جانتا ہو اور اگر عربی میں خطبہ پڑھنے والا مجمع میں کوئی نہ ہو تو لوگوں پر ظہر کی ادائیگی لازم ہوگی، جمعہ ساقط ہوجائے گا''**ولو كان الجماعة عجمًا لا يعرفون العربيّة، فلو كان ليس فيهم من يُحسن الإتيان بالخطبة عربية لم يلزمهم جمعة**'' [حاشية الدسوقي على الشرح الكبير: ۳۷۸/۱، نقلاً عن المقالات الفقهيّة] نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: خطبہ کا خاص عربی زبان ہی میں ہونا ضروری ہے کہ تمام مسلمانوں کا مشرق ومغرب میں ہمیشہ اسی پر عمل رہا ہے۔ [مصفی شرح موطا:۱۵۲،م: مطبع فاروق دہلی]

(ج) تین طلاق سے ایک ہی طلاق ہونی چاہیے

ڈاکٹر ذاکر صاحب فرماتے ہیں:

''تین طلاق کے لیے اتنی شرائط ہیں، جن کا پورا ہونا ناممکن ہے، سعودیہ کے تین سو فتوے موجود ہیں؛ اس لیے

طلاق ایک ہے،آج کے حالات کے مطابق ایک ہونی چاہیئے"[خطبات ذاکر نائک بحوالہ حقیقت ذاکر نائک:۳۳۱]

حالاں کہ صحابۂ کرام،تابعین عظام ائمہ اربعہ اور جمہور امت، نیز موجودہ دور کے سعودیہ عربیہ کے تمام معتبر علما کے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاق سے تین ہی طلاق واقع ہوتی ہیں ایک نہیں،اس مسئلے میں پوری تاریخ میں کسی معتبر عالم کا اختلاف نہیں،سوائے علامہ ابن تیمیہؒ اوران کے شاگرد علامہ ابن القیم کے؛لیکن پوری امت (جن میں بڑے بڑے تابعین، چاروں ائمہ امام ابوحنیفہ،امام شافعی،امام مالک،اورامام احمد بن حنبلؒ شامل ہیں) کے مقابلے میں اِن دوحضرات کی رائے قطعاً قابل اتباع نہیں ہے،ڈاکٹر صاحب ایسے اجماعی حکم کے خلاف مسئلہ بیان کرکے امت کو گمراہ کررہے ہیں۔ یہ حکم یعنی تین طلاقوں سے تین ہی طلاق کا واقع ہونا قرآن کی آیت، بے شمار احادیث اور صحابۂ کرام کے تعامل سے واضح طور پر ثابت ہے، چند حدیثیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) **وقال الليث عن نافع كان ابن عمر إذا سئل عَمَّنْ طَلَّقَ ثَلاثًا قال لو طَلَّقْتَ مَرَّةً أو مَرَّتين (لكان لك الرجعة) فإن النّبى صلى اللّٰه عليه وسلم أمَرَنِى بهٰذا (أي بالمراجعة) فإن طلّقها ثلاثاً حرمت حتى تنكح زوجًا غيره**

[بخاری شریف، ۲:۷۹۲، نیز ۲:۸۰۳]

حضرت نافع فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر سے جب اس شخص کے متعلق فتویٰ دریافت کیا جاتا جس نے تین طلاقیں دی ہوں،تو فرماتے اگر تو نے ایک یا دوطلاق دی ہوتی (تو رجوع کرسکتا تھا) اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اس کا (یعنی رجعت کا) حکم دیا تھا،اور اگر تین طلاق دیدے تو عورت حرام ہوجائے گی یہاں تک کہ وہ دوسرے مرد سے نکاح کرے۔

(۲) **عن مجاهد قال كنت عند ابن عباس فجاء ه رجل فقال: إنه طلّق امرأته ثلاثا، قال: فسكت حتى ظننتُ أنه رادُّها إليه، ثم قال: ينطلق أحدكم فيركب الحَموقَة ثم يقول يا ابن عباس يا ابن عباس فإن الله عز وجل قال ﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا﴾ عصيتَ ربّك وبانتْ منك امرأتُك.** [أخرجه أبوداؤد: ۱/۲۹۹، باب في الطلاق على الهزل، رقم: ۱۸۷۸]

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ میں ابن عباسؓ کے پاس تھا، کہ ایک شخص آیا اور کہا کہ اس نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدی، فرماتے ہیں کہ حضرت عباس خاموش رہے میں سمجھا کہ وہ اس کی بیوی کو لوٹا دیں گے (رجعت کا حکم دیں گے) مگر فرمایا:تم میں سے کوئی شخص حماقت کر بیٹھتا ہے (تین طلاق دیدیتا ہے) پھر چلاتا ہے ابن عباس!ابن عباس!۔تو (سنو!) ارشاد باری تعالیٰ ہے:"جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کے لیے راہ نکالتے ہیں۔تم نے تو اپنے رب کی نافرمانی کی (تین طلاق دیدی) اس لیے تمہاری بیوی تم سے جدا ہوگئی۔

(۳) **وعن مالك بلغه: أن رجلا قال لعبد اللّٰه بن عباس: إنى طَلّقتُ امرأتى مائة تطليقة ، فماذا ترى علىَّ ؟ فقال ابن عباس: طَلُقَتْ منك بثلاث، وسَبْعُ وتسعون اتَّخَذْتَ بها آياتِ اللّٰه هُزُوا** [أخرجه الإمام مالك: ۱۹۹]

حضرت امام مالکؒ کو یہ روایت پہنچی کہ ایک آدمی نے عبداللہ ابن عباسؓ سے دریافت کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیدیں، آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟ تو ابن عباسؓ نے جواب دیا: (ان میں سے) تین طلاقیں تیری بیوی پر پڑگئیں، اور ستانوے طلاقوں سے تو نے اللہ کی آیتوں کا کھلواڑ کیا۔

(۴) **عن مالك بلغه: أن رجلا جاء إلى عبد اللّٰه ابن مسعود فقال: إنى طلقتُ امرأتى ثمانىَ تطليقات ، قال ابن مسعود ، فماذا قيل لك ؟ قال: قيل لى: إنها قد بَانتْ مني، فقال ابن مسعودٍ صدقوا. (الحديث)** [الموطا للإمام مالك: ۱۹۹]

حضرت امام مالکؒ کو یہ روایت پہنچی کہ ایک آدمی عبداللہ ابن مسعودؓ کے پاس آیا، اور کہا: میں نے اپنی بیوی کو آٹھ طلاقیں دی

ہیں۔حضرت ابن مسعودؓ نے پوچھا کہ لوگوں نے تمہیں کیا کہا؟ اس نے جواب دیا کہ میری بیوی بائنہ ہوگئی۔تو حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: سچ کہا۔(یعنی تین طلاقیں پڑگئیں)

(۵) **حدثنا علی بن محمد بن عبید الحافظ نا محمد بن شاذان الجوهری نا معلّی بن منصور نا شعیب بن رزیق أن عطاء الخراسانی حدّثهم عن الحسن قال نا عبد اللّٰه بن عمر أنه طلّق امرأتَه تطلیقةً وهی حائض ثم أراد أن یتبعها بتطلیقتین أخریین عند القرأین فبلغ ذلک رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فقال یا ابن عمر ما هٰکذا أمرک اللّٰه إنک قد أخطأتَ السنَّةَ. والسنَّة أن تستقبل الطهر فیطلق لکل قرء قال فأمرنی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فراجعتها ثم قال إذا هی طهرت فطلِّق عند ذلک أو أمسِک فقلتُ یا رسول اللّٰه أرأیتَ لو أنّی طلقتها ثلٰثاً أکان یحلّ لي أن أراجعها قال لا، کانت تبین منک وتکون معصیة.** [سنن دار قطنی، ۲:۴۳۸، زاد المعاد، ۲:۲۵۷، مصنف ابن أبی شیبة بحواله عینی شرح کنز:۱٤۱، سنن دار قطنی، ٤:۳۱، مطبوعه قاهرة]

حضرت حسن کا بیان ہے کہ ہم سے حضرت ابن عمرؓ نے بیان فرمایا کہ انھوں نے اپنی اہلیہ کو حالتِ حیض میں ایک طلاق دیدی پھر ارادہ کیا کہ دوطہروں میں بقیہ دوطلاقیں دیدیں گے،حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا اے ابن عمر! اس طرح اللہ نے تم کو حکم نہیں کیا ہے،تم نے سنت طریقہ کے خلاف کیا (کہ حالت حیض میں طلاق دیدی) سنت طریقہ یہ ہے کہ طہر کا انتظار کیا جائے اور ہر طہر میں ایک طلاق دی جائے اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے رجوع کرنے کا حکم فرمایا چنانچہ میں نے رجوع کرلیا پھر فرمایا جب وہ پاک ہوجاوے تو تم کو اختیار ہے چاہو تو طلاق دیدینا یا اس کو روکے رکھنا،حضرت ابن عمر فرماتے ہیں پھر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! اگر میں نے تین طلاقیں دی ہوتیں تو کیا میرے لیے رجوع کرنا جائز ہوتا؟ حضور نے فرمایا نہیں،اس صورت میں بیوی تم سے جدا ہوجاتی اور تمہارا یہ فعل (تین طلاقیں ایک ساتھ دینا) گناہ ہوتا۔

آپ نے دیکھا کہ مذکورہ بالا حدیثوں میں تین طلاق سے تین ہی طلاق کے واقع ہونے کا حکم ہے۔ان کے علاوہ اور بہت سی روایتیں صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہیں کہ تین طلاقوں سے تین ہی طلاق واقع ہونگی،ایک نہیں۔

نوٹ: ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب نے اپنی تقریر میں سعودیہ کے تین سو علما کے فتاوے کا حوالہ دیا،پھر اپنی رائے بھی پیش کی؛ لیکن یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ کون سے علما ہیں جب کہ سعودی عرب کی تحقیقاتِ علمیہ کے موقر مفتیان نے تین طلاق سے تین ہی طلاق کا فتویٰ دیا ہے۔قرارداد اس طرح ہے:

> **" بعد الاطلاع علی البحث المقدم من الأمانة العامة لهیئة کبار العلماء والمعد من قبل لجنة الدائمة للبحوث والإفتاء في موضوع "الطلاق الثلاث بلفظ واحد" وبعد دراسة المسألة وتداول الرأي واستعراض الأقوال التي قیلت فیها ومناقشة ما علی کل قول من إیراد توصل المجلس بأکثریته إلی اختیار القول بوقوع الطلاق الثلاث بلفظ واحد ثلاثاً....**
>
> **إلخ** [مجلة البحوث الإسلامیة، المجلد الأول، العدد الثالث سنة ۱۳۹۷هـ]

(د) ڈاکٹر صاحب ایک پروگرام "گفتگو" میں تقریر کرتے ہوئے مشورہ دیتے ہیں کہ:

"مسلمانوں کو ایسا طریقہ اپنانا چاہیے کہ پوری دنیا میں ایک دن عید ہوسکے"۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے ارشادِ نبوی "**صوموا لرؤیته وأفطروا لرؤیته**" "یعنی چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی افطار کرو"

کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ عقلِ سلیم کے بھی خلاف ہے؛ اس لیے کہ وحدتِ عید کا مسئلہ اصل میں اس بنیاد سے پیدا ہوتا ہے کہ عید کو ایک تہوار یا ملکی تقریب یا قومی ڈے قرار دیا جائے؛ مگر یہ انتہائی غلط سوچ ہے؛ اس لیے کہ ہماری عیدین، رمضان اور محرم کوئی تہوار نہیں؛ بلکہ سب کی سب عبادات ہیں، نیز اوقات کا ہر ملک ہر خطہ میں وہاں کے افق کے اعتبار سے مختلف ہونا لازمی ہے، ہم ہندوستان میں جس وقت عصر کی نماز پڑھتے ہیں، اس وقت واشنگٹن میں صبح ہوتی ہے، جس وقت ہم ہندوستان میں ظہر کی نماز ادا کرتے ہیں، اس وقت لندن میں مغرب کی نماز ہوچکی ہوتی ہے، نیز ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ملک میں جمعہ کا دن ہوتا ہے تو دوسرے میں ابھی جمعرات ہے اور تیسرے میں سنیچر کا دن شروع ہوچکا ہے، ان حالات میں کسی ایک دن میں پوری دنیا والوں کے عید منانے کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے۔

الغرض ان تنقیدات کی روشنی میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب بہت سے مسائل میں اہل سنت والجماعت کے عقائد سے ہٹے ہوئے ہیں، قرآن وحدیث کی تشریح میں لغتِ عرب اور سلف سے منقول تفاسیر کو نظر انداز کرکے عقل خام کی مدد سے تفسیر کرکے، تحریف معنوی کے شکار ہیں، نیز وہ (ڈاکٹر صاحب) علوم شرعیہ اور مقاصد شریعت سے گہری واقفیت نہ ہونے کے باوجود کسی امام کی تقلید نہیں کرتے؛ بلکہ اُلٹے وہ ائمہ مجتہدین پر تنقید کرتے ہیں؛ اس لیے ان (ڈاکٹر صاحب) کی باتیں ہرگز قابل اعتبار نہیں، ان کے پروگرام کو دیکھنا، ان کے بیانات سننا اور بلا تحقیق ان پر عمل کرنا سخت مضر ہے۔ اور چونکہ واقعی تحقیق کرنا ہر کس وناکس کی بات نہیں؛ اس لیے ان کے پروگرام سے عامۃ المسلمین کو احتراز کرنا ضروری ہے۔ نیز ہر مؤمن کو یہ بات ہمیشہ مستحضر رکھنا چاہیے کہ دین کا معاملہ، جو ایک حساس معاملہ ہے، انسان دین کی باتیں سنتا اور ان پر عمل کرتا ہے، صرف آخرت میں نجات پانے کے لیے، اس میں صرف نئی نئی تحقیق، برجستہ جوابات، حوالوں کی کثرت اور لوگوں میں بہ ظاہر مقبولیت دیکھ کر، بلا تحقیق کسی کی بات پر ہرگز عمل نہیں کرنا چاہیے؛ بلکہ انسان پر ضروری ہے کہ وہ غور کرلے کہ وہ آدمی دینی علوم میں کیا اہلیت رکھتا ہے؟ کن اساتذہ سے علم حاصل کیا ہے؟ کس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی، اس کی وضع قطع، لباس، ہیئت دیگر علما وصلحا سے میل کھاتی ہے یا نہیں؟ نیز معاصر قابل اعتماد علما اور مشائخ کی اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے؟ اسی طرح یہ بھی دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس سے متاثر ہونے والوں اور اس کے گرد جمع ہونے والوں میں صحیح دینی شعور رکھنے والے کتنے ہیں اور دینی خدمات سے وابستہ معتبر لوگ کس حد تک؟ اگر کچھ معتبر لوگ قریب ہیں تو ان سے معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟ اور وہ کیوں قریب ہیں؟ ایسا تو نہیں کہ کسی غلط فہمی، معلومات کی کمی یا کسی مصلحتِ مزعومہ کے تحت وہ قریب دکھائی دے رہے ہوں؟ حاصل یہ ہے کہ ان تمام باتوں کی تحقیق کے بعد اگر اطمینان ہوجائے، تبھی دینی معاملے میں اس کی باتیں قابل اعتبار اور لائق عمل ٹھہریں گی، ورنہ اس سے دور رہنے ہی میں ایمان کی سلامتی ہے، مشہور تابعی محمد بن سیرین کا مقولہ ہے: "إن هذا العلم دين فانظروا عمّن تأخذون دينكم" یعنی دین کی باتوں کو سننے اور سیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ خوب غور کرلو کہ کیسے لوگوں سے علم حاصل کررہے ہو اور دین سیکھ رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ (آمین)

زین الاسلام قاسمی الہ آبادی
نائب مفتی، دارالافتاء دارالعلوم، دیوبند
۲۰/۳/۱۴۳۲ھ=۲۴/۲/۲۰۱۱ء

الجواب صحیح

حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　محمود حسن غفرلہ بلند شہری　　وقار علی غفرلہ　　فخر الاسلام عفی عنہ